# پریم چند کے افسانوں میں فلسفہ اخلاق

# Philosophy of Ethics in Prem Chand's fictions

**نعمت اللہ**
(پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو: جی سی یونیورسٹی فیصل آباد)
**ڈاکٹر اصغر علی بلوچ**
(پروفیسر شعبہ اردو: جی سی یونیورسٹی فیصل آباد)

**Abstract:**

Prem Chand is one of the pioneers of Urdu Afsana writers. His stories are very near to life. He has been promoting basic ethical values through his stories. His main emphasis was to the values of promote humanity, justice, equality, sacrifice and gratitude. Mostly his characters belong to rural life, where landlords and Mahajans have been oppressing the poor. Praim Chand highlighted such oppressions in his stories and gave the way outs to stop these oppressions."

**Key Words:** Fiction, Philosophy of Ethics,Prem Chand, Landlords, Nationalism, Realism, Human Equality

**کلیدی الفاظ:** افسانہ، فلسفہ اخلاق، پریم چند، جاگیر دار، وطن پرستی، حقیقت پسندی، انسانی مساوات

افسانہ اردو ادب کی اہم بلکہ معتبر صنف ہے جس میں ادیب اپنا مافی الضمیر کہانی کے ذریعے کرتا ہے اور موضوع کی اہمیت کے پیش نظر کسی مخصوص کردار پہ توجہ مرکوز کرتا ہے۔ افسانے کی ابتدا اسی دن ہو گئی تھی جب انسان اس دنیا میں آیا۔ جو بات اُس نے کہی، جو کہانی اس نے بیان کی وہ افسانہ بن گئی اور جو کہانی عمل کر کے دکھائی وہ ڈرامہ بن گیا اور جو کہانی گا کر سنائی وہ گیت یا شاعری بن گئی۔ انسان اور کہانی ایک ساتھ پیدا ہوئے۔ کہانی زندگی، واقعات اور کشمکش کا نام ہے اور افسانہ فطرت اور زندگی کا اہم جزو ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

> "خدا نے جس دن انسان کو پیدا کیا اور شیطان سے سجدہ کرنے کو کہا اس دن افسانہ پیدا ہو گیا۔ یہ انسان کا پہلا تجربہ تھا جو اماں حوا نے بیان کیا اور اولادِ آدم کا بیان افسانہ ہو جاتا ہے۔"(۱)

اُردو افسانہ کی ابتدا اور نشوونما بیسویں صدی کے ادبی شعور اور ذہنی ربط سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اول نسب ناموں کا کھوج لگانے والے اس کا رشتہ قدیم کہانیوں، حکایتوں اور معنوں سے جوڑتے ہیں لیکن ان تمام عناصر کے باوجود اُردو افسانہ عصری تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک نئے شعور کا اظہار اور ایک نئی دریافت ہے جو اپنی تہہ در تہہ معنوی خصوصیات کی وجہ سے کہانی کی ہیئت کا عکس معلوم ہوتا ہے۔

اُردو افسانے میں اخلاقیات کے ابتدائی نقوش علامہ راشد الخیری، منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور کلاسیکی افسانہ نگاروں کے ہاں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کے اردو افسانے میں تین رجحانات نمایاں ہیں۔ سب سے اہم رجحان پریم چند اور ان کے مقلدین کا ہے۔ یہ رجحان حقیقت پسندی کا رجحان کہلاتا ہے۔ معاشرے کی تلخ حقیقتوں اور برائیوں کو بڑے سلیقے سے بیان کرنے کا رجحان ہے۔ انہوں نے سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھی۔ انہوں نے گاؤں کی زندگی اور مسائل کو نمایاں طور پر افسانے میں جگہ دی۔ ان کا دردمند دل عام انسانوں کی محرومیوں اور تکلیفوں پر تڑپ اُٹھتا تھا اور وہ ان کی زندگی کے حالات و واقعات کو ایسے موثر ڈھنگ میں پیش کرتے ہیں کہ دوسروں کے دلوں میں ان کے لیے ہمدردی اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ مقامی رنگ سے وہ بڑا کام لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت میں بول چال کی بے تکلف زبان کا بہت دخل ہے۔

اس دور کا دوسرا نمایاں رجحان، زندگی کی رومانوی اور جذباتی ترجمانی کے رجحان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری کر رہے تھے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا رومانوی تصورات اور لطیف جذبات سے بوجھل ہے۔ ان کے ہاں فرد کے جذباتی رشتوں، مثلاً حسن و عشق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ انسانی جذبات کو جاگیر دارانہ سماج، قدامت پسندانہ رسوم و رواج اور فرسودہ اخلاقی بندھنوں سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں فنی حسن کا ایک نیا انداز ہے۔ اسلوب اور اظہار بیان کی دلکشی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔

تیسرا اہم رجحان مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی گھریلو زندگی اور اس کے مسائل کو اصلاحی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کا رجحان ہے۔ اس کا سلسلہ ایک طرف نذیر احمد تو دوسری طرف سلطان حیدر پوش سے ملتا ہے۔ راشد الخیری، فضل حق قریشی اور عظیم بیگ چغتائی نے اپنے ڈھنگ سے اس رجحان کی نمائندگی کی اور وہ مسلمانوں کی گھریلو معاشرتی و معاشی زندگی سے اپنے افسانوں کا مواد حاصل کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر اگر ان تینوں رجحانات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں ایک عنصر غالب نظر آتا ہے اور وہ عنصر اخلاقیات کا عنصر ہے۔ ان تینوں مختلف قسم کے رجحانات کے حامل افسانہ نگاروں نے اپنے فن افسانہ نگاری کے ذریعے معاشرے کے مختلف طبقوں اور پہلوؤں کی اخلاقی پرداخت اور نشوونما کا کام لیا۔ ان تینوں مختلف قسم کے رجحانات کے حامل افسانہ نگاروں پر فلسفہ اخلاق کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں جابجا ایسے پہلو نظر آتے ہیں جن میں کرداروں اور مکالموں کے ذریعے معاشرے کے مجموعی اخلاق کو بہتر بنانے کی سعی کرتے نظر

آتے ہیں۔ بعض افسانوں میں یہ سعی کھل کر سامنے آتی ہے۔ افسانہ نگار کا اخلاقی بلندی کے پیغام کا مطمع نظر واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

اگر افسانہ نگاری کو باقاعدہ ایک مکمل فنی روایت کے طور پر دیکھیں تو ابتدائی افسانہ نگاروں میں پریم چند ایک اہم نام ہے۔ افسانوی ادب کا عظیم نام جس نے اپنے افسانوں میں معاشرتی خرابیوں اور غربت واستحصالی کو موضوع بنایا۔ پریم چند کے افسانوں میں فلسفہ اخلاق کے اثرات کہیں پر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں ان اثرات کی واضح جھلک فرسودہ رسوم ورواج کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتے ہوئے دیکھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی اور اس کے ساتھ انسانوں کی مفلوک الحالی، ناانصافی، طبقہ بندی، زمینداروں اور جاگیرداروں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ پریم چند ہندوستان کی دیہی زندگی کے مسائل اور ان کی وجہ سے بہ خوبی واقف تھے۔ پریم چند بنارس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ احساسِ محرومی و تنہائی نے زندگی کے اوّلین سفر میں ان کا ہاتھ تھاما اور دیہات کے ماحول میں ان کی تربیت ہوئی۔ انہوں نے آغاز ہی میں دیہاتی زندگی کے تلخ حقائق اور اذیت ناک حالات سے مکمل آگاہی حاصل کرلی تھی۔ پریم چند کے اندر چھپے فنکار نے قلم کے ذریعے ان حالات کی سنگینی کو پیش کرنے کا عزم کیا۔ وہ یوں زندگی بھر معاشرتی مظلوم اور پسماندہ طبقے کے لیے امن اور عزت کی جدوجہد کرتے رہے۔

پریم چند کے افسانوں میں اس وقت کے حالات، اخلاقی اقدار اور وقت کی سنگینی، مکمل طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ زمانہ سیاسی و سماجی سطح پر انتشار لیے ہوئے تھے۔ اس منتشر معاشرے کی حقیقی تصویر ہمیں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> ”پریم چند کا زمانہ برصغیر میں سیاسی، سماجی اور معاشی کشمکش کے عروج کا دور تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات روز بروز بڑھ رہے تھے۔۔۔ مذہبی بنیادوں پر تفریق نے معاشرتی شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ ایک دوسرے کے مذہبی امور میں دخل اندازی تشدد اور قتل وغارت گری کی صورت اختیار کر گئی۔ استحصال زدہ طبقے پر اجارہ داری کی گرفت نئے سرمایہ داری نظام کی بدولت مزید مضبوط ہو گئی۔ یہی فضا اور ماحول پریم چند کے افسانوں کی بنیاد ہے۔“(۲)

پریم چند کے افسانوں میں خیالی، تخیلاتی فضا کی بجائے تلخ حقیقتوں کا انکشاف دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے معاشرے کی اخلاقی پستی کے ان پہلوؤں کی عکاسی اور ترجمانی کی ہے جو صحیح معنوں میں مدتوں سے اس کے منتظر تھے۔ جہاں ظلم کی چکی میں پستی اور سسکتی زندگی اس بات کی متقاضی ہے کہ کوئی ان تڑپتی روحوں کو مسیحائی بخشے۔ محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

"پریم چند کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خیالی دنیا پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کے لیے وہ دنیا بہت اہم تھی جو اس کے سامنے اپنی تلخ حقیقتوں کے ساتھ موجود تھی۔"(۳)

پریم چند نے اُردو افسانہ کو حقیقت نگاری کی ایک نئی جہت سے متعارف کرایا۔ انہوں نے لفظی صنائی اور تخیل کی مصوری کی بجائے حقائق اور واقعات کو اپنا موضوع بنایا۔ اپنے افسانوں کے ذریعے انہوں نے اصلاحِ معاشرہ کا کام کیا۔ وہ روایات کے پاسدار تھے مگر فرسودہ روایات کے سخت خلاف تھے۔ وہ انسانی فکر کی مثبت تعمیر کے لیے کوشاں تھے۔ معاشرتی جبر اور ناہمواری انہیں بے قرار رکھتی تھی۔ معاشی بدحالی، جہالت، فرقہ واریت، چھوت چھات، توہم پرستی اور بے عملی جیسی برائیاں ہیں جو پریم چند کے عہد میں معاشرے کو ناسور کی طرح ختم کر رہی تھیں۔ انہوں نے حالات کو غیر مطمئن صورت حال میں دیکھا۔ ان کے سامنے کوئی اور حربہ نہیں تھا کہ وہ ماضی کو مثال بنا کر قوم کو تلقین کر سکیں اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جگا سکیں۔

پریم چند کے افسانوں پر فلسفہ اخلاق کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ بنیادی اخلاقی قدروں، حب الوطنی، ایثار، رحمدلی، ایفائے عہد، احترام آدمیت، سچائی، نیکی اور ہمدردی کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ معاشرے میں پائی جانے والی غیر اخلاقی قباحتوں پر صدائے احتجاج بلند کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ استحصال، برائی، چھوت چھات، غیر اخلاقی اور فرسودہ رسوم اور دوسری اخلاقی بُرائیوں کے خلاف پریم چند نے مذہب اور فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ انہوں نے انسانی اقدار کا احترام اور ہندوستان کے عوام کو اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا۔ انہوں نے بھوک، بیماری، جہالت، افلاس اور توہم پرستی پر کاری ضربیں لگائیں۔ پریم چند کے افسانوں میں موجود مختلف اخلاقی پہلوؤں کو کئی محققین اور نقادوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"ایک عام فرد کی ذہنی الجھنوں، سماجی بندشوں، معاشرتی پیچیدگیوں اور ان سے پیدا ہونے والے دکھوں اور غموں کو اجاگر کرنے کی کوشش پریم چند نے بہت خوبی سے کی ہے۔"(۴)

ارشد محمود آصف راقم ہیں:

"وہ مانتے تھے کہ معاشرے میں صالح قدروں کے فروغ اور سیاسی آزادی کے بغیر انسانی خوش حالی کا تصور محض سراب ہے۔ اپنے اصلاحی مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے اپنے افسانوی ادب میں انہی مسائل کو موضوع بنایا۔۔۔ ان کی تصانیف کے سرورق میں آزادئ اظہار، حب الوطنی اور انسان دوستی کا درس ملتا ہے۔"(۵)

پریم چند کے افسانوں میں اخلاقی پہلوؤں کا کھوج لگاتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"پریم چند کے افسانوں میں جابر رئیسوں، ظالم زمینداروں اور سود خور مہاجنوں کی کایا جس طرح پلٹی ہے وہ انسان کو محض مجسمہ خیر سمجھتے اور سنگین سماجی تضادات کو چند شرارتی بچے جان کر فہمائش کرتے اور انہیں ندامت کے عرق میں تحلیل کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔"(۶)

ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر، پریم چند کے افسانوں میں سے اخلاقی پہلوؤں پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"سماجی گھٹن، قدامت پسندی، مذہبی استحصال، اقتصادی بدحالی، حب الوطنی اور آزادی جیسے موضوعات اُن کے افسانوں کا موضوع ہیں۔ ذہنی پس ماندگی، قدامت پرستی دیہاتیوں کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے۔ دیہاتیوں میں چودھریوں، برہمنوں اور مولویوں نے رسوم و رواج، جاتی برادری اور مذہب کے نام پر استحصالی نظام کا جال بچھا رکھا ہے۔ سود خور برہمن قرض دے کر مقروض کے جسم کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں اس سارے ماحول اور نظام کی نفرت انگیز ڈراؤنی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔"(۷)

پریم چند کے افسانوں میں تصور اخلاق ایک خاص تہذیبی سطح رکھتا ہے جو مذہبی عصبیت سے ماوار ہے۔ ان کے افسانوں میں بعض اسلامی تعلیمات کا عکس ان کی کشادہ قلبی کا ثبوت ہے۔ انھیں اس امر کا ادراک ہے کہ اسلام انسانوں کو مساوات اور بھائی چارے کے بندھن میں مضبوطی سے باندھتا ہے۔ اسلام میں تمام انسان برابر ہیں۔ ہاں اگر کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی امتیاز اور برتری حاصل ہے تو یہ رنگ، نسل، دولت کی بنیاد پر ہرگز نہیں ہے بلکہ تقویٰ اور پرہیز گاری کی بنا پر ہے۔ تقویٰ اور پرہیز گاری کے معیاری اخلاق کا دامن پکڑنا بہت ضروری ہے۔ فلسفہ اخلاق یا اخلاقیات کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہی انسان تقویٰ حاصل کر سکتا ہے۔ اخلاقیات کی تعلیمات اور قدروں میں جہاں دوسری معاشرتی قدریں ہیں وہیں ایک قدر حب الوطنی ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب یا دین یہ نہیں کہتا کہ وطن سے محبت نہ کرو۔ وطن کی محبت کا درس ہر مذہب اور ملت میں موجود ہے اور وطن کی محبت میں انسانوں نے جو قربانیاں دی ہیں تاریخ کے اوراق ان کے سب سے بڑے گواہ ہیں۔

پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعے میں اخلاقیات کی یہ قدر یعنی حب وطن بڑی خوبصورتی سے موجود ہے۔ پریم چند نے وطن کی محبت کا درس دیا ہے۔ اس کے لیے وطن کی محبت سے بڑھ کر کسی چیز کو مول نہیں دیا۔ اپنے پہلے افسانوی مجموعے اور اپنی اول زندگی کے پہلے افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن" میں پریم چند نے وطن سے محبت کی اخلاقی قدر کو اُجاگر کیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک نوجوان "دلفگار" ہے۔ دل فگار ایک حسین دیوی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے جس کا نام دلفریب ہے۔ دل فگار اپنے عشق کا اظہار جب دلفریب سے کرتا ہے تو وہ اسے کہتی ہے کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو میرے لیے دنیا کی سب سے بیش بہا چیز

لے کر آ۔ جب تو دنیا کی سب سے بیش قیمتی شے لے کر آجائے گا تو میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔ دل فگار کے لیے یہ مرحلہ بڑا دشوار ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی بیش قیمتی چیزوں کے متعلق سوچتا ہے اور انہیں حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مادی اشیاء سے سوچتا ہوا غیر مادی اشیاء اور جذبات کی طرف نکل جاتا ہے۔ چنانچہ چند ماہ کی تلاش کے بعد دلفریب کے پاس واپس آتا ہے اور اسے دنیا کی سب سے بیش قیمتی چیز کے طور پر آنسو کا وہ قطرہ پیش کرتا ہے جو سزائے موت کے ایک قیدی نے اپنے بچپن کی آزاد زندگی کو یاد کر کے بہائے تھے۔ دلفریب اسے رد کرتی ہے اور ایک اور موقع دلفگار کو دیتی ہے اور اب کی بار کئی مہینوں کی کڑی تلاش کے بعد وہ دلوں کی محبت کی داستان کی ایک نشانی دلفریب کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ وہ اسے بھی قبول نہیں کرتی اور دل فگار یعنی اپنے عاشق کو دنیا کی سب سے بیش قیمتی چیز تلاش کرنے کا ایک آخری موقع دیتی ہے۔ اب کی بار وہ کھوج کرتا کرتا ایک ایسی جگہ جا نکلتا ہے جہاں چند لمحے پہلے ایک جنگ لڑی گئی تھی اور ایک جواں مرد اپنے وطن کی حفاظت کرتے کرتے زخمی ہو اپڑا تھا۔ دلفگار اس جواں مرد کے پاس جاتا ہے۔ وہ زخموں سے چور تھا اور اپنی داستان یوں کہتا ہے کہ وہ اپنے وطن، اپنی آزادی کے لیے لڑا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہی وطن میں غلامی کی زندگی گزارے۔ اس اثنا میں وہ اپنے وطن کی حفاظت کرنے کا نعرہ لگا کر اپنے جسم کا آخری قطرہ خون بھی بہا دیتا ہے اور اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دیتا ہے۔ دل فگار خون کا آخری قطرہ لے کر اپنی محبوبہ دلفریب کے دربار میں داخل ہوتا ہے۔ بیش قیمتی چیز کے طور پر قطرہ خون پیش کرتا ہے اور اس کی کہانی کو سناتا ہے۔ دلفریب پردے سے باہر نکل آتی ہے اور دل فگار کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ بے شک تم دنیا کی قیمتی ترین چیز لے کر آگئے ہو۔ اب میں تمہاری کنیز ہوں۔ پریم چند اس افسانے کا اختتام یوں کرتے ہیں:

> ”یہ کہہ کر اس نے ایک مرصع صندوقچہ منگوایا اور اس میں سے ایک لوح نکالا جس پر آبِ زر سے لکھا ہوا تھا: وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمتی شے ہے۔“(۸)

اس کہانی کے ذریعے پریم چند نے جہاں وطن سے محبت کی اخلاقی قدر کو اُجاگر کیا ہے وہیں اس کا دوسرا پہلو محنت اور لگن بھی ہے۔ انسان اپنی لگن اور محنت سے ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ یہ محنت لگن اور جذبہ ہی تھا جس نے دل فگار کو دلفریب کی طرف سے لگائی گئی شرط پوری کرنے کے قابل بنایا۔ پریم چند انسانی محنت اور لگن کی ترغیب بھی دیتے ہیں اور حب وطن کا لطیف جذبہ بھی بیدار کرتے ہیں۔

رشوت زنی، اختیارات کا ناجائز استعمال، پیشہ وارانہ بدیانتی ایسے مسائل ہیں جنھوں نے ہماری بنیادی اخلاقی اقدار کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کرپشن کی کہانی نے وطن عزیز کی جڑوں کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ اظہار مشکل ہے۔ پریم چند نے اس غیر اخلاقی روش کے خلاف بھی قلم اُٹھایا ہے۔ چنانچہ ان کا افسانہ ”نمک کا داروغہ“

اس کی ایک مثال ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک نوجوان ہے جس کا نام ہنسی دھر ہے جو نمک کے محکمے میں داروغہ مقرر ہوتا ہے۔ اس کا باپ اسے رشوت لینے اور ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کی ترغیب دیتا ہے لیکن باپ کی ترغیب کے برعکس ہنسی دھر اپنے فرائض منصبی دیانتداری سے انجام دیتا ہے۔ ایک شام دورانِ ڈیوٹی وہ علاقے کے جانے مانے رئیس پنڈت الوچی دین کو نمک کی غیر قانونی سمگلنگ کرتے ہوئے پکڑ لیتا ہے۔ پنڈت الوچی دین اُسے بھاری رقم بطور رشوت پیش کرتا ہے لیکن ہنسی دھر یہ کہتے ہوئے لینے سے انکار کر دیتا ہے:

"ہم اُن نمک حراموں میں سے نہیں جو کوڑیوں میں اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔"(۹)

یہاں منشی پریم چند دراصل ایمانداری کی اخلاقی قدر کو اُجاگر کرتے ہیں اور ایمانداری کو بے ایمانی و بددیانتی پر حاوی کرتے ہیں۔ ایمان فروشی کو پست اور ایمانداری کو بلند کرتے ہیں۔ فرض شناسی و دیانتداری کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہنسی دھر ایمان فروش نہیں ہے۔ وہ دولت کے انبار کو فرض شناسی سے جاندار ٹھوکر مارتا ہے، لیکن ہوتا وہی ہے جو معاشرے میں ایماندار افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔ معاملہ عدالت میں جاتا ہے اور عدالتی نظام کی فرسودگی اور جانب داری اپنا کام دکھاتی ہے اور پنڈت جی اس سے بازیابی حاصل کرتے ہیں۔ پھر وہ کسی نہ کسی اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ہنسی دھر کی معطلی کا پروانہ جاری کراتے ہیں۔ ہنسی دھر نوکری سے معطل ہو کر گھر آتے ہیں۔ گھر والے انہیں ایمانداری کا طعنہ دیتے ہیں۔ طعنے سہتے سہتے وقت گزرتا ہے۔ ایک دن وہی پنڈت لوچی دین ہنسی دھر کے گھر آتے ہیں۔ سب دیکھ کر حیران ہوتے ہیں لیکن اسی وقت ان کی حیرانی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب پنڈت جی ایک کاغذ ہنسی دھر کو دیتے ہیں۔ کاغذ دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ پنڈت الوچی دین نے اپنی تمام جائیداد کا مختارِ عام ہنسی دھر کو بنا دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شاندار تنخواہ کے ساتھ ساتھ روزانہ خرچ، سواری کے لیے گھوڑے اور غیر محدود اختیارات بھی۔ یہ ایمانداری کا صلہ تھا۔ وہی ایمانداری کا جس نے ہنسی دھر کو رشوت نہ لینے اور فرض شناسی کی تلقین دی تھی۔ وہی ایمانداری جس کے طعنے اسے اپنے سگے باپ سے مل رہے تھے۔ پریم چند افسانے کے ذریعے جہاں رشوت سے پرہیز کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہیں ایماندار اور فرض شناسی کو اعلیٰ اور ارفع قرار دیتے ہیں۔ افسانے کے اختتام میں درج کرتے ہیں کہ:

"الوپی دین نے قلم دان سے قلم نکالا اور ہنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے "مجھے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فراست کی، نہ کارکردگی اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بار بار دیکھ چکا ہوں۔۔۔ یہ قلم حاضر ہے زیادہ تامل نہ کیجیے۔ اس پر آہستہ سے دستخط کیجیے۔ میری پرماتما سے یہ التجا ہے کہ آپ کو سدا وہی ندی کنارے والا بے مروت، سخت زبان، تند مزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔"(۱۰)

یعنی ایمانداری، دیانتداری اور فرض شناسی ہمیشہ انسان کے لیے بہتری کے وسائل پیدا کرتی ہیں۔ انسانی اخلاق کی بلندی اور تعمیر میں ایمانداری اور دیانتداری کو بڑا دخل ہے۔ اگر انسان اپنا اخلاق اور شخصیت بہتر بنانا چاہتا ہے تو اسے ان جواہر سے آراستہ ہونا پڑے گا پریم چند کا یہ افسانہ بدی کے مقابلے میں نیکی کی جیت، بددیانتی کے مقابلے میں ایمانداری اور دیانتداری کی فتح کا حسین اظہار ہے۔ انسان اگر وقتی فائدے کے تحت اپنی حسین دیانتداری کو داؤ پر نہ لگائے تو اللہ اس کے لیے کئی راستے اور منزل آسان کر دیتا ہے۔

اخلاقی اقدار میں "انصاف پسندی" کی قدر انتہائی اہم ہے۔ انصاف معاشرے میں توازن قائم کرتا ہے۔ بے انصافی سے معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں انصاف کی تعلیم سب سے اہم ہے۔ بلکہ اسلام کے پھیلنے کی اہم ترین وجوہات میں ایک انصاف بھی ہے۔ پریم چند نے اعلیٰ اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے افسانوں کے ذریعے ان اقدار کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ عدل و انصاف اور دیانت داری کا موضوع بھی پریم چند کے افسانوں کی زینت ہے۔ پریم چند نے جس عہد میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہ سیاسی افراتفری، نفسانفسی کا عہد تھا۔ ظلم، جبر، تشدد، جہالت اور کم علمی نے اہل ہندوستان کو اس حد تک گمراہ کر رکھا تھا، کہ ان کا تشخص ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ پریم چند نے افسانہ "پنچایت" کے ذریعے جہاں معاشرے میں پھیلی اس سنگین زیادتی کو موضوع بنایا وہیں عدل و انصاف کی اخلاقی قدر کو فروغ دیا۔ مذکورہ افسانہ کا مرکزی کردار شیخ جمن اور اس کا دیرینہ دوست انگو چودھری ہے۔ جمن نے اپنی بیوہ خالہ کی زمین یہ کہہ کر اپنے نام کرالی کہ وہ خالہ جان کے نان نفقہ کا خیال رکھے گا لیکن جمن کے اس دعوے کا ساتھ دینے پر جو ہندوستان میں ایسے موقعوں اور وقتوں میں ہوا کرتا ہے، خالہ روٹیوں کی محتاج ہو گئی، تنگ آ کر خالہ نے پنچایت کی دھمکی دی۔ جمن کو اس لیے کوئی خوف نہ تھا کہ پورے علاقے میں جمن کے خلاف پنچایت کرنے کی کوئی ہمت نہ رکھتا تھا۔ خیر پنچایت کا موقع آیا۔ خالہ اور جمن کے درمیان فیصلے کے لیے انگو جمن کے بہترین دوست تھے کو پنچ بنایا گیا جمن خوش تھا کہ انگو دوستی کا لحاظ رکھے گا اور وہ خالہ کے حق میں اور میرے خلاف ہرگز فیصلہ نہ دے گا۔ انگو کو منصف بنتے ہی اپنے مرتبے کا خیال آیا۔ اس نے فریقین کے دلائل سنے اور فیصلے سے قبل جمن کی غلط فہمی ان الفاظ میں رفع کی:

> "شیخ جمن! ہم اور تم پرانے دوست ہیں۔۔۔ مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو نہ ہم تمہارے دوست، یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔"(۱۱)

اس کے بعد جمن کے خلاف فیصلہ ہوا جو حقیقتاً حق اور انصاف پر مبنی تھا۔ جمن سکتے میں آ گیا اور انگو کی دوستی پر لعنت بھیجی۔ دل میں ٹھان لی کہ بدلہ ضرور لے گا۔ خوش قسمتی سے بدلہ لینے کا موقع بھی مل گیا۔ انگو کا

اپنے گاؤں کے آدمی "سمجھو سیٹھ" سے بیل کی قیمت لینے پر تنازع ہو گیا۔ مسئلہ پنچایت میں لایا گیا۔ سمجھو سیٹھ نے جان بوجھ کر جمن شیخ کو پنچ بنایا۔ وہ جانتا تھا کہ جمن انگو کے دشمن ہو گئے ہیں اور وہ فیصلہ انگو کے خلاف دے کر اپنی دشمنی پوری کر لے گا لیکن مسند انصاف پر بیٹھتے ہی جمن کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور اس نے حق اور انصاف پر مبنی فیصلہ سنایا جو انگو کے حق اور سمجھو سیٹھ کے خلاف تھا۔ جمن نے دشمنی نبھانے کی بجائے حق اور ایمانداری کا ثبوت دیا۔ ہر انسان اپنی ذات میں قاضی ہوتا ہے۔ پریم چند نے اس افسانے کے ذریعے اسی حقیقت کو آشکار کرنے کی کوشش کی۔ وہ انسانی جذبات میں ہلچل پیدا کرتے ہیں۔ منصفین کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے انصاف ہی سے معاشرے قائم و دائم رہتے ہیں۔ بے انصافی سے معاشرے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ اس لیے ذاتی فوائد و نقصانات سے بالاتر ہونا پڑتا ہے۔ انصاف کی تعلیم ہی اس افسانے کا مرکزی موضوع ہے۔ اس سلسلے میں افسانے کے آخری کلمات ملاحظہ ہوں جن میں افسانہ نگار کس خوبصورتی سے ذاتیات سے نکل کر حق اور انصاف پر مبنی فیصلہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے:

> "جمن شیخ، انگو چودھری کے پاس آئے اور ان کے گلے لپٹ کر بولے "بھیا! جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے، میں دل سے تمہارا جانی دشمن تھا لیکن مجھے آج معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔ انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا، یہ بھی خدا کی شان ہے، آج مجھے یقین آ گیا کہ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہوتا ہے۔"(۱۲)

پریم چند نے اپنے افسانوں میں تقریباً تمام اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا۔ انہوں نے عدل و انصاف کے ساتھ حقوق العباد پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور ان حقوق کی تبلیغ و آگاہی میں خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ پریم چند کے افسانوں پر فلسفہ اخلاق کے اثرات کو لے کر ڈاکٹر محمد احسان الحق راقم ہیں:

> "اعلیٰ اخلاقی اقدار کی سربلندی اور ان کے فروغ کی خواہش، انسان دوستی، ناداروں اور بے کسوں کی ہم نوائی، آزادی کی تمنا۔۔۔ یہ وہ عناصر ہیں جو پریم چند کے افسانوں کے بدن میں خون کی طرح رواں رہتے ہیں۔"(۱۳)

ڈاکٹر صاحب نے پریم چند کے افسانوں میں حقوق العباد کی اخلاقی اقدار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بندوں کے حقوق کی بازپرس سے متعلق احکاماتِ دین بہت سخت ہیں اور اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو معاشرہ حقوق العباد کی پاسداری ہی سے ترقی کرتا ہے۔ باہمی امن، محبت اور بھائی چارے کے فروغ کے لیے حقوق العباد کا پورا کرنا بے حد ضروری ہے، انسانوں کے مابین محبت و الفت کے جذبات کے فروغ سے معاشرہ محبت اور سکون و اطمینان کا گہوارہ بنتا ہے۔ یوں تو پریم چند کے افسانوں میں امن و محبت اور انسانی ہمدردی پر مبنی اخلاقی اقدار جابجا نظر آتی ہیں لیکن حج اکبر، عید گاہ، بے غرض محسن ایسے افسانے ہیں جن میں اخلاقی اقدار و روایات کے کئی پہلو بہ

یک وقت نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوی مجموعے "پریم بتیسی" میں شامل ایک افسانہ "حج اکبر" اس حوالے سے بڑا اہم ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار "عباسی" ہے جو کہ منشی صابر حسین اور اس کی سخت مزاج بیوی "شاکرہ" کے ہاں دایہ ہے۔ اس کا کام ان کے ننھے بیٹے نصیر کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ بچے پیار کے بھوکے ہوتے ہیں انہیں مذہب، فرقہ، رنگ، نسل، اپنے پرائے یا مالک و ملازم کا امتیاز تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ جس نے پیار کیا اسی کے ہو لیے۔ عباسی نے نصیر کو وہ محبت دی کہ نصیر اپنے حقیقی ماں باپ کی بجائے اپنی ملازمہ سے بے حد انس کرنے لگا۔ عباسی (ملازمہ) بھی نصیر سے بے حد محبت کرتی تھی۔ محبت کی اس کہانی کے ذریعے رشتوں میں خلوص اور بے غرضی کی خوشبو کو آشکار کرتے ہیں۔ عباسی کی نصیر سے محبت اور انس۔ اس کے نیک دل اور بے لوث ہونے کی دلیل ہے۔ وہ ملازمہ ضرور ہے لیکن اپنا کام ایمانداری سے کرتی ہے۔ وہ حقوق العباد کی پاسدار ہے اور نصیر کی ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود اپنی ڈیوٹی میں کوئی کمی نہیں چھوڑتی اور نصیر سے پوری محبت کرتی ہے کہ گویا اس نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہو۔ ملازمہ کا اپنے بیٹے سے ایمانداری اور نصیر سے انس و محبت افسانے میں اکثر جگہ دیکھنے میں آتا ہے:

> "دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے باخبر نہیں۔"(۱۴)
>
> "وہ نصیر کے لیے ماں سے چھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے اُبٹن ملتی کہ بچہ خوب پروان چڑھے۔"(۱۵)

یہ ہے دایہ کی نصیر سے بے لوث محبت، وہ محبت جو ایک سگی ماں کو ہی اپنے بیٹے سے ہو سکتی ہے لیکن دایہ اپنے کام اس ایمانداری سے کرتی ہے کہ نوکری اور ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی بدرجہ اتم پورے کرتی ہے۔ نصیر کی ماں دایہ پر ہمیشہ طعن و تشنیع کی بارش کرتی ہے۔ یہ سلسلہ رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ دایہ یعنی عباسی کو گھر چھوڑنا پڑتا ہے لیکن وہ بچے کی جدائی میں نڈھال رہتی ہے۔ ادھر بچے کا یہ حال ہے کہ وہ نہ سوتا ہے نہ کھاتا پیتا ہے ہر وقت بس ایک ہی رٹ لگائی ہے کہ "انا کہاں ہے، انا کہاں ہے؟" وہ عباسی کو پیار سے انا کہتا تھا۔ عباسی بھی اس کی محبت میں بے قرار رہتی ہے۔ بچہ دن بدن کمزور ہوتا جاتا ہے۔ عباسی حج کا ارادہ کرتی ہے۔ سامان باندھتی ہے اور ٹرین میں سوار ہو کر حجاز مقدس کے لیے سفر باندھتی ہے۔ نصیر کا والد یعنی صابر حسین عباسی کو تلاش کرتے کرتے اسٹیشن تک پہنچ جاتا ہے۔ عباسی کو نصیر کی گرتی صحت کا علم ہوا تو اس نے چھاتی پیٹ لی اسباب ٹرین سے اُتروایا اور فوراً صابر حسین کے ساتھ ہو لی۔ بچے کو گلے لگایا اور پیار کیا۔ چند دن میں بچہ صحت مند ہو جاتا ہے۔ ایک دن عباسی نصیر کو پیار کرتے ہوئے کہتی ہے:

"کیوں بیٹا! مجھے تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا، میرے حج کا ثواب کون دے گا؟ صابر نے مسکرا کر کہا "تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا، اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔"(۱۶)

پریم چند کا افسانہ "بے غرض محسن" اِس حوالے سے بڑا منفرد ہے کہ افسانے میں بہ یک وقت کئی اخلاقی اقدار کو فروغ دیا گیا ہے۔ بے غرض مدد، محنت، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا، نشہ ثروت میں ڈوبنے کے نقصان جیسے اخلاقی موضوعات کو افسانہ نگار نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے ایک ہی افسانے میں پرو دیا ہے۔ ریوتی ایک اوسط درجے کے زمیندار گھرانے کی بہو ہے اور اپنے بیٹے کو لیے میلے کی سیر کو آتی ہے۔ بد قسمتی سے اس کا شیر خوار بیٹا پاؤں پھسلنے سے گہرے پانی میں گر پڑا۔ فکر مند ہوئی، مدد پکاری لیکن کوئی بھی جوان ہمت نہ تھا جو مدد کو آتا رو رہی تھی اور بچہ منوں پانی میں ڈوبا جاتا تھا۔ آخر ایک جواں مرد گھوڑے سے اُترا اور اپنی دھوتی سمیٹ کر پانی میں چھلانگ لگائی، بچے کو بہ حفاظت باہر لے آیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس جواں ہمت نے یہ کام خالصتاً انسانی ہمدردی میں کیا۔ اسے کسی قسم کی دولت یا عزت کا کوئی لالچ نہ تھا۔ وہ نہ ہی اپنی بہادری کی داد لینا چاہتا تھا نہ ہی معاشرے میں اس نیکی کی بدولت اپنا سر اونچا کرنا چاہتا تھا۔ اس بے غرض خدمت کا اندازہ یوں ہوتا ہے:

"ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر لڑکا دو منٹ بھی پانی میں اور رہتا تو بچنا غیر ممکن تھا مگر جب۔۔۔ لوگ اپنے گم نام محسن کو ڈھونڈنے لگے تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے سارا میلہ چھان مارا، مگر نظر نہ آیا۔"(۱۷)

سال گزرتے گئے بچہ بڑا ہوتا گیا۔ ہیرا من نام کا یہ بچہ بڑے بلند بخت لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کی محنت اور ذہانت سے ان کے ہاں خوب دُھن برس رہا تھا۔ ہیرا من کی ماں آج بھی اس بے غرض محسن کی تلاش میں تھی جس نے اپنی جان پر کھیل کر اس کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ وہ بے غرض محسن یعنی تخت سنگھ اپنی چھوٹی سی زمین پر کاشتکاری کرتا تھا۔ ہیرا من نے وہ گاؤں خرید لیا جہاں تخت سنگھ رہتا تھا۔ تخت سنگھ جواں ہمت بوڑھا تھا۔ اس نے ثروت کے نشے میں ڈوبے زمین دار ہیرا من کو اپنی زمین دینے سے انکار کر دیا۔ ہیرا من کو یہ اپنی توہین محسوس ہوئی۔ ہیرا من نے اپنی ستائیسویں سال گرہ کے موقع پر تخت سنگھ کو سبق سکھانے کے لیے اس کی زمین نیلام کرنے کا دن مقرر کیا۔ ایک رات تخت سنگھ اور اس کی بیوی ٹھکرائن کو یہ علم ہو گیا کہ ہیرا من وہی بچہ ہے جو بیس سال قبل پانی میں ڈوب کر مر جانے والا تھا اور جس کی جان تخت سنگھ نے بچائی تھی۔ ٹھکرائن۔۔۔ ان کو بتانا چاہتی ہے لیکن تخت سنگھ منع کر دیتا ہے۔ خیر وہ دن آیا کہ ہیرا من نے دولت و ثروت کے نشے میں چور غریب تخت سنگھ کو اس کی خودی اور عزت نفس کا سبق سکھا ہی دیا۔ زمین لے لی اور بوڑھا بڑھیا در و دیوار کے

محتاج ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد ہیرا من کی ماں کو ایک خواب کے ذریعے یہ اندازہ ہوا کہ سات برس کی عمر میں جس شخص نے اپنی جان پر کھیل کر اس کے بچے کو پانی میں ڈوب کر مرنے سے بچایا تھا وہ کوئی اور نہیں بلکہ تخت سنگھ تھا۔ اب دونوں ماں بیٹے کے پاس ندامت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس افسانے کے ذریعے پریم چند نے بنیادی طور پر تین اخلاقی اقدار کی تبلیغ کی ہے۔ پہلی، بے غرض خدمت و مدد جو تخت سنگھ نے بغیر کسی انعام اور لالچ کے بچے کو پانی میں ڈوبنے سے بچانے میں کی۔ تخت سنگھ نے بڑھاپے اور سخت ترین حالات کے باوجود اپنا رزق محنت سے کمایا۔ اس نے نہ ہاتھ پھیلایا اور نہ ہی ہیرا من کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہی اس کا محسن ہے جس نے اس کی جان بچائی۔ تیسری اور سب سے اہم اخلاقی قدر، ہٹ دھرمی، انتہاپسندی اور تکبر و غرور سے بچنے کی قدر ہے۔ ہیرا من نے اپنی ہٹ دھرمی، ضدی اور انا کی وجہ سے ایک غریب کسان کو نقصان پہنچایا جس کا پچھتاوا اسے رہتی سانسوں تک رہے گا۔

افسانہ "عید گاہ" اس حوالے سے بڑا اہم ہے کہ پریم چند نے افسانے کے ذریعے خود اعتمادی، عزتِ نفس اور باہمی پیار و محبت کی اخلاقی اقدار کو فروغ دیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک بچہ "حمد" ہے جس کے ماں باپ انتقال کر چکے ہیں۔ اب اس کا اس دنیا میں واحد سہارا اس کی دادی ہے۔ دادی حامد سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور عید کے موقع پر حامد کے لیے مدتوں سے بچائے ہوئے تین پیسے بہ طور جیب خرچ جمع رکھتی ہے۔ عید کا دن ہے۔ حامد کو تین پیسے دیتی ہے اور دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ عید گاہ کی طرف روانہ کر دیتی ہے۔ عید گاہ سے واپسی پر حامد کے ہم جولی کھلونے اور مٹھائیاں خریدتے ہیں۔ حامد کا جی بھی چاہتا ہے کہ وہ بھی یہ سب خریدے لیکن غربت آڑے آتی ہے۔ اس کی جیب میں تو فقط تین پیسے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بچہ احساس کم تری کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اپنی غربت اور جیب میں موجود تین پیسوں کے مثبت پہلو سوچتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ سب چیزیں جو اس کے ہم عمر خرید رہے ہیں بالکل بے کار ہیں۔ افسانے میں اکثر موقعوں پر اس کیفیت کا اظہار ملتا ہے:

> "نہیں کھلونے فضول ہیں، کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ ڈھل جائے۔"(۱۸)

حامد کی اس سوچ اور کلمات کے ذریعے دراصل پریم چند انسانی خواہشات کو قابو میں رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ انسانی خواہشات تو نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ آج ایک شے کی خواہش ہے تو کل دوسری چیز پر دل مچلے گا۔ نتیجتاً انسان خواہشوں کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ حامد بچہ ہے لیکن اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا جانتا ہے۔ دوسرا اس بچے کو اپنی فکر لاحق نہیں ہے۔ وہ ایک سمجھدار بچہ ہے۔ اسے نہ صرف اپنی خواہشوں کو قابو میں کرنا

آتا ہے بلکہ وہ دادی کے دیئے ہوئے تین پیسوں کو کہاں خرچ کرتا ہے یہ بات اس کے بچے کی زبانی سنیے۔ وہ حقوق العباد کا علم بردار ہے۔ وہ دوسروں کی تکلیف سے بہ خوبی واقف ہے:

"حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہے تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے کر ماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں بھی کبھی نہیں جلیں گی۔ گھر میں کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ؟ مفت کے پیسے برباد ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔"(۱۹)

یہی نہیں بلکہ پریم چند نے اپنے افسانوں میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں جنم لینے والی بد اخلاقی کو بھی موضوع بنایا۔ انہوں نے مذکورہ نظام کی قباحتوں، کسانوں کے استحصال اور غربت کی چکی میں پستی عوام کے زخموں پر مرہم رکھا ہے۔ پریم چند نے ان افسانوں کے ذریعے نہ صرف اخلاقی جرات کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ مظلوم طبقے کو ہمدردی اور راہنمائی بھی عطا کی ہے۔ دودھ کی قیمت، زور کا ڈبہ، گردِ راہ، مشعل ہدایت وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے پیدا ہونے والی اخلاقی برائیوں کا نقشہ بہت اچھے طریقے سے کھینچا گیا ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں ایسے اخلاقی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے اعجاز راہی لکھتے ہیں:

"اُن کے ادب میں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کی سچی اور حقیقی تصویر ملتی ہے۔ بغاوت کرنے، کسان اور ناانصافیوں میں گھری ہوئی شہری زندگی۔۔۔ لوگوں کو پیس دینے والے تعصّبات، توہم پرستی، اذیت پسندی، سرکاری حاکموں کی ناانصافیاں یہ ہیں وہ موضوعات جنہیں پریم چند نے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔"(۲۰)

## حوالہ جات


۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، جدید اُردو افسانے کے رجحانات، مطبوعہ الفاظ (علی گڑھ) افسانہ نمبر، جلد دوم، مئی تا اگست ۱۹۱۸ء، ص:۱۷۸

۲۔ شفیق انجم ڈاکٹر، اردو افسانہ، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء) ص:۶۲، ۶۱

۳۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ صورت و معنی، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،) ص:۳۵

۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۹ء،) ص:۵۶۸

۵۔ ارشد محمود آصف، "اردو افسانہ اور آزادی اظہار کے مسائل، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد: ۲۰۰۸ء، ص۹۵

۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، (مرتب)، پریم چند کی بیس کہانیاں (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۳ء،) ص:۱۱

۷۔ اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر، اردو کے ۵۲ افسانے (ایک تنقیدی مطالعہ)، (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۲۰۱۰ء) ص:۱۱۸

۸۔ پریم چند، سوزِ وطن (مقدمہ و حواشی: علی احمد فاطمی)، (الٰہ آباد: تہذیب نور پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء،) ص:۳۲

۹۔ انوار احمد، ڈاکٹر، (مرتب) پریم چند کی بیس کہانیاں، ص:۷۷

۱۰۔ ایضاً، ص:۸۲

۱۱۔ ایضاً، ص:۸۷

۱۲۔ ایضاً، ص:۹۳

۱۳۔ محمد احسان الحق، ڈاکٹر، افسانے کا فن اور پریم چند کے افسانے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء) ص:۳۰

۱۴۔ منشی پریم چند، پریم بتیسی، (دہلی، اداراہ فروغ اردو، س ن،) ص:۱۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۲۳

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۴۱

۱۷۔ طاہر منصور فاروقی، (مرتب)، پریم چند کے بے مثال افسانے (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء،) ص:۲۴

۱۸۔ پریم چند کی بیس کہانیاں، ص:۲۰۴

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۰۵

۲۰۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ، (راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء) ص:۴